Article

Loakh: Retrieving Ancient Historical Events

لواخ: قدیم تاریخی واقعات کی بازیافت

Dr Muhammad Kamran Shehzad*[1]
Visiting Lecturer, Deptt of Urdu, University of Sargodha ,Sargodha

[1]ڈاکٹر محمد کامران شہزاد
وزٹنگ لیکچرار اردو، شعبہ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

Correspondance: kamranshehzadranjha786@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 21-09-2023
Accepted:20-12-2023
Online:29-12-2023

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Among the novelists of the 21st century, Akhtar Raza Saleemi has a stable identity based on historical themes, unique techniques and styles. His three novels have been published so far, including "Jage Hain Khab Mein", "Jinder" and "Loakh" respectively. "Loakh" is his new novel published recently, in which warlike clans are shown fighting for their survival and also shows the lamp of these tribes in modern times by burning the Loakh of their ancestors to create a new identity. In this article, the war strategies of the warrior tribes in the hilly areas and deferent topics are analyzed in the novel.

KEYWORDS: Akhtar Raza Saleemi, Lavakh, Urdu Novel, Warrior Tribes ,Historical Events.

ادب جس بھی عہد میں بھی تخلیق کیا جا رہا ہو ،وہ تخلیق کار کی باطنی کیفیت کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سیاسی، معاشی، مذہبی، تہذیبی، سماجی حالات وواقعات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر ادب اپنے عہد کا نمائندگی کرتا ہے لیکن اس کے موضوعات، ڈسکورس اور بیانیہ ہر دور میں مختلف رہے۔ فکری تناظر میں ادب میں بڑی تبدیلی 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برپا ہوئی کیونکہ سماجی انتشار، اقتصادی تنزلی اور اخلاقی شکست وریخت کے باعث معاشرہ تباہ وبرباد ہو گیا تھا۔ یہ سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں براہ راست ادب پر اثر انداز ہوئیں۔ اس حوالے سے جہاں انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ذریعے پروان چڑھنے والی نظم میں نو آبادیاتی نظام کے خلاف آواز بلند کی گئی تو دوسری طرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے سرسید تحریک کے حامی ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس تحریر کر کے ناول صنف کی داغ بیل ڈالی۔ انیسویں صدی میں نذیر احمد کے ساتھ عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار نے مقصدی اور اصلاحی ناول رقم کیے۔ انیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے ناول سفر کرتا ہوا منفرد موضوعات اور اسلوب کے ساتھ اکیسویں صدی میں بھرپور انداز نے داخل ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں مستنصر حسین تارڑ، مرزا اطہر بیگ، محمد الیاس، شمس الرحمن فاروقی، حسن منظر، طاہرہ اقبال، فہمیدہ ریاض، خالد فتح محمد وغیرہ نے جہاں اُردو قارئین کے لیے منفرد موضوعات پر لازوال ناول تحریر کیے وہیں ایک نام اختر رضا سلیمی کا ہے۔ جنھوں نے اب تک تین ناول بالترتیب جندر، جاگے ہیں خواب میں اور لواخ لکھے ہیں۔ ان کا اولین "جاگے ہیں خواب میں" 2015ء میں منظر عام پر آیا، جس میں مصنف نے جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیک کے ذریعے نفسیات، طبعیات، مابعد طبعیات، تاریخ اور فلسفہ جیسے دقیع موضوعات کو تسبیح کے دانوں کی طرح لڑی میں پرو دیا۔ علاوہ ازیں 2005 کے زلزلے میں جمادات، نباتات اور حیوانات کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کا تنزل بھی بیان کیا ہے۔(1) دوسرا ناول "جندر" 2017ء میں شایع ہوا اور اسے یو بی ایل ایوارڈ (فکشن) سے نوازا گیا۔ یہ ناول مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے۔ ایک ایسے کردار کی کہانی ہے، جو اپنے وجود کے ساتھ اس تہذیب کو مٹتے دیکھتا ہے، جس کی بنیاد اس کے آباو اجداد نے رکھی تھی ۔ "لواخ" مصنف کا تیسرا ناول ہے، جس کو 2023ء میں رمیل ہاؤس پبلی کیشنز راولپنڈی نے شایع کیا ہے۔ 184 صفحات پر مشتمل ناول کو تئیس (23) حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

"لواخ" پہاڑی علاقوں میں گم جنگجو قبیلوں میں سے ایک قبیلے کی کہانی ہے، جو اپنی بقا کے لیے سکھوں کے سردار امر سنگھ سے جنگ لڑ کر اسے شکست دیتے ہیں اور اپنے مستقبل کی نسلوں کو اپنی فتوحات اور کارناموں کے متعلق بتانے اور فخر کرنے کے لیے نوشتہ تحریر کر جاتے ہیں تاکہ ان کی نسلیں اپنے اجداد کے عظیم کارناموں کو نہ صرف یاد رکھیں بلکہ وہ اگلی نسلوں کو بھی بتا کر جائیں۔ ناول میں "سکندر" مرکزی کردار ہے، جو عہد حاضر میں اپنے قبیلے میں واحد زندہ شخص ہے۔ اس کے باپ دادا نے کئی معرکے کی جنگیں فتح کی ہوئی ہیں۔ اس کے باپ نے امر سنگھ مجیٹھیہ جیسے سورماؤں کو میدانِ جنگ میں شکست دی ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جس کا ماضی تو بہت شاندار ہوتا ہے لیکن حال رنج والم کی تصویر ہے ،جب سکندر کو بستی کا اگلا سردار منتخب کیا جاتا ہے تو ایک دو روز بعد ہی اسے خبر ملتی ہے کہ اس کے باپ، چاچوؤں، ماموؤں،

خاندان اور بستی کے دیگر افراد کو انگریزوں کے ساتھ ہونے والی ایک جھڑپ میں مار دیا گیا ہے۔ ابھی وہ ماؤں کے سینے سے لگ کے رویا بھی نہیں ہوتا کہ بستی پر انگریز حکام حملہ کرتے ہیں۔ کسی طرح سکندر کو وہاں سے فرار کروا دیا جاتا ہے لیکن پھر انگریزوں کی جانب سے پوری بستی کو آگ لگا دی جاتی ہے اور اس کی دونوں مائیں، محبوبہ، خاندان اور بستی کی دیگر خواتین عزت جانے کے خوف سے اپنے سینوں میں خود چھرا گھونپ کر جان دے دیتی ہیں۔ سکندر اپنے باپ کے ہاتھ کے لکھے نوشتے کو تنتیس (33) برس چھپاتا پھرتا کیونکہ اگر انگریزوں کو علم ہو جاتا تو وہ اسے فوراً مار دیتے۔ لیکن پھر اپنی بقا کے لیے اپنے ماضی کا ہر نشان (باپ کے ہاتھ کا لکھا مسودہ) کو لواخ میں جلا کر ختم کر دیتا ہے۔ وہ نوشتہ جسے لکھنے کا مقصد ہی آنے والی نسلوں کو مستند تاریخی معلومات فراہم کرنا تھا جلتے الاؤ کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور انگریز ہندوستان پر مسلط ہو گئے تھے۔ ماضی میں فاتح مسلمان آج فرنگیوں اور ہندوؤں کے غلام ہو گئے ہیں اس لیے "سکندر" اپنی بقا کے لیے باپ کی پگڑی کو گدائی کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہاں ایک عہد کا خاتمہ اور آنے والے عہد کا آغاز نظر آتا ہے۔ ناول کے اختتامی جملے ناول کے موضوع کا تعین کرتے ہیں ملاحظہ کیجیے :

"کچھ عرصہ پہلے جب مردم شماری والے یہاں آئے اور انھوں نے مجھ سے میرا نام، قوم اور پیشہ پوچھا تو میں نے اپنا نام مستانہ خان ولد منگتا خان، قوم فقیر اور پیشہ گداگر لکھوا دیا ہے"(2)

گو ناول کی ساری کہانی تاریخی پس منظر میں لکھی گئی ہے لیکن محولا بالا ناول کے آخری جملوں پر عمیق نگاہ ڈالیں تو یہ چند جملے عہدِ حاضر کی پاکستانی مسلمان قوم پر واضح طنز کیا گیا ہے، جن کے آباؤاجداد بہادر اور دلیر اور تحریک پاکستان کے عظیم رہنما تھے۔ ان رہنماؤں نے اپنی انتھک محنت سے ملک آزاد کر کے دیا، لیکن افسوس آج ستر برسوں بعد بھی یہ قوم بھکاری اور فقیر ہے، جو مغربی فرنگیوں کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ "لواخ" ہندوستان کی قدیم تاریخ و تہذیب کا آئینہ دار ہے تو غلط نہ ہو گا کیونکہ ناول مہاراجہ رنجیت سنگھ یعنی سکھوں اور انگریزوں کی جانب سے مسلمانوں پر کیے جانے والے مظالم کی داستان سناتا ہے۔ "لواخ" کو معلوماتی اور تاریخی ناول کے ساتھ ساتھ رزمیہ ناول بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ کہانی میں جنگی حکمت عملیوں اور مناظر کی منظر کشی بھی ملتی ہے جیسے جنگ کے باعث ہونے والی قتل و غارت، جنگوں میں کی جانے والی سازشیں، منصوبہ بندی، سپہ سالاروں کی بہادری اور شجاعانہ کارناموں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً بالا کوٹ کی جنگ، جنگ ناڑہ، میدان ہزارہ کی لڑائی اور مری کی جھڑپوں کی عکس بندی کی گئی ہے یعنی پہلے سکھوں کی مسلمانوں سے لڑائیوں اور پھر انگریزوں کی مسلمانوں سے لڑائیوں کا ذکر کہانی کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک جنگجو جب کسی معرکے کے لیے روانہ ہوتا ہے تو اس کے احساسات و جذبات کیا ہوتے ہیں؟، جب ایک قبیلہ یا علاقہ فتح سے ہمکنار ہوتا ہے تو کیسے خوشی ہر سوں رقص کرتی دکھائی دیتی ہے اور جب کسی معرکہ یا جنگ میں شکست کا سامنا ہوتا ہے تو غم والم کے جذبات کتنے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اپنوں کو کھونے کی تکلیف کے

جذبے کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ جنگ کے دوران ہر قبیلے کی نفسیاتی کش مکش کا احاطہ یہ ناول کرتا ہے جنگ پر جانے سے قبل خانی زمان خان سکندر کو کہتے ہیں کہ:

"ہم نے اگرچہ اپنی طرف سے پوری تیاری کی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہم اس بار بھی سرخرو لوٹیں گے لیکن آدمی جب محاذ جنگ پر ہوتا ہے تو موت اس کے لیے بالکل ایک بے معنی چیز ہو کر رہ جاتی ہے؛ میں نے ہر جنگ اپنی زندگی کی آخری جنگ سمجھ کے لڑی ہے"(3)

جب خانی زمان خان مری کے معرکہ میں ہار جاتے ہیں اور انہیں مار دیا جاتا ہے اور پھر انکی بستی کو بھی جلا دیا جاتا ہے۔ تو خاندان کی خواتین نے اپنی عزت نیلام کرنے بجائے موت کو ترجیح دی اور سکندر کی ماؤں نے اپنے سینے میں خنجر مار کر زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ یہاں قاری کو یہ سبق بھی ملتا ہے کہ قبیلے کے مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی دلیر تھیں، کیونکہ انھوں نے اپنی عزت کا سودا کرنے کے بجائے بخوشی موت کو گلے لگا لیا تھا۔ اس حوالے سے عبدل چچا سکندر کو بتاتا ہے کہ:

"کل مرنے والے سب لوگوں کو دفنا دیا گیا ہے۔ تمہاری دونوں ماؤں نے سینوں میں چھرا گھونپنے سے پہلے، مجھے بلوایا تھا اور میرے آگے ہاتھ جوڑے تھے کہ سکندر کو واپس بستی نہ آنے دینا"(4)

ناول کا اہم موضوع "پولیس کا مظلوموں کے ساتھ سفاکانہ رویہ" بھی ہے، پہاڑی علاقوں میں جب کوئی واردات ہوتی تو متعلقہ تھانے میں ہلچل مچ جاتی اور قریبی بستیوں میں چھاپے مارنا شروع کر دیتی، جب پولیس کو اصلی مجرم نہیں ملتے تو وہ ان کی جگہ پر بے گناہ غریب لوگوں کو پکڑ لیتی ہے، جو بھوک اور گھر والوں کے ستائے ہوئے مزار پر آ جاتے ہیں۔ اور یہ بے گناہ افراد پولیس کی ظالمانہ تفتیش اور تشدد کے خوف سے وہ جرم بھی قبول کر لیتے ہیں جو انھوں نے کبھی کیا ہی نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے چند ایسے لوگ شامل ہوتے ہیں جن کو جائے وقوعہ کا حدود اربعہ کا بھی علم نہیں ہوتا ہے۔ پولیس معاملات کو مزید نکھارنے کے لیے اپنے ہی لکھے بیان پر ان سے انگوٹھے کا نشان بھی لگوا لیتی ہے اور یہ بیان فرد کو رٹوا دیا جاتا ہے تاکہ عدالت میں ان لوگوں سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔ پولیس کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں کو "شک کی رعایت" نہ مل سکے کیونکہ یہ اصول انھوں نے صرف ان لوگوں کے لیے بنایا ہوتا ہے جنھوں نے حقیقتاً جرم کیا ہوتا ہے اور ان سے بھاری انعام ملنے کی توقع ہوتی ہے پھر پولیس اپنے ان عظیم کارناموں کو بتا کر حکامِ بالا کی خوشنودی بھی حاصل کر لیتی ہے۔ غربت اور بھوک کے ستائے ہوئے گرفتار کیے جانے والے لوگ بھی سال چھ مہینے جیل کی ہوا کھانا بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ جیل میں مفت کی دال روٹی کھا لیتے ہیں جو شاید باہر بغیر کوشش کے نہ ملے۔ ناول نگار اس تلخ حقیقت کو ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

"گرفتاری کے خوف سے، یہاں سے بھاگ کر قریبی جنگل کی کھائیوں میں پناہ لینے والے سارے لوگ جانتے ہیں کہ وہ، وہ نہیں جن کی ان سپاہیوں کو تلاش ہے؛ اس پر مستزاد یہ کہ وہ سپاہی جنھوں نے انھیں پکڑنے کے لیے یہاں پہ چھاپا مارا تھا، وہ بھی اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جنہیں ہم گرفتار کرنے آئے ہیں، وہ، وہ نہیں ہیں جن کی ہمیں تلاش ہے"(5)

ناول میں برطانوی سامراج کی عکس بندی بھی کی گئی ہے کہ انگریز جو اس وقت حاکم تھے اور یہاں کا سارا سرمایہ اپنے ملک ولایت بھجوا کر وہاں معیشت کو مضبوط کر رہے تھے لیکن یہاں کے غریب باشندوں چاہے وہ مسلمان ہے یا ہندو یا سکھ

،انھیں یہ بھیڑ بکریاں لگتے ہیں، جن کو جس طرف ہانکیں گے وہ اس طرف چل دیں گے، جو مقامی لوگ ان کے وفادار اور ملازم ہوتے تھے ان پر بھی اعتبار نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کی نظر میں ان پر اعتبار کرنا انھیں اپنے برابر بٹھانے کے مترادف ہے، جس کا اظہار ان کی مخصوص عمارتوں پر لگی تختی سے ہوتا ہے۔ چند جملے ملاحظہ کیجیے :

"یہاں دیسیوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے'

حالاں کہ میں نے سنا ہے کہ کتے رات کو ان کی بیویوں کے ہمراہ، ان کے بستروں میں سوتے ہیں "(6)

مصنف نے ان جملوں میں لفظ "کتے" ذو معنی استعمال کیا ہے ایک طرف فرنگی یہاں کی غریب عوام کو کتے کہہ کر اپنی عمارتوں میں داخلہ ممنوع کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف ناول نگار نے اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر نفرت کا اظہار منفرد انداز میں کیا ہے۔ لیکن یہی انگریز اپنے مفادات کے لیے یہاں کے مختلف اداروں میں بیٹھے ہندوستانیوں کو انعامات اور زمینوں کا لالچ دے کر اپنی مرضی کے کام کراتے تھے، جیسے کہ پولیس کے لوگوں کو استعمال کر کے اپنے من پسند مجرموں کو مکھن میں بال کی طرح نکال لیتے تھے جبکہ غریب اس کی جگہ جیل میں سزا بھگتا تھا۔

ناول کا ایک موضوع "خانقاہی نظام" بھی ہے۔ برصغیر پاک وہند کے باشندوں کا پیروں فقیروں پر پختہ اعتقاد ہوتا ہے اور عموماً لوگ خانقاہوں، مزاروں یا درباروں پر زندگی کے کٹھن مراحل میں اپنے پیر و مرشد سے فیض حاصل کرنے جاتے ہیں۔ اس خانقاہی نظام پر ناول میں ہلکا سا طنز دیکھنے کو ملتا ہے۔ مصنف نے حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہانی میں دکھایا ہے کہ سکندر کا دادا ایک عام شخص تھا۔ لیکن اس کی وفات کے بعد اس کی قبر پر باقاعدہ مزار تعمیر ہو جاتا ہے۔ لوگ منتیں مرادیں مانگنے آنے لگتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ سکندر کے دادا یعنی سید محمد خان سے وہ باتیں اور خصوصیات بھی منسوب کر لی جاتی ہیں جو ان کی شخصیت اور زندگی میں شامل ہی نہیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح کھنڈر حویلی جہاں سید محمد خان کا مقبرہ کنجور کے پتھروں سے بنا ہوتا ہے پھر وہاں عالیشان مزار تعمیر ہو جاتا ہے۔ پہلے جو جگہ ویران ہوتی تھی چلہ گاہ بننے کے بعد میں اس پر رونق ہونے لگتی ہے۔ اس کی شروعات ایک شخص سے ہوتی ہے اور پھر یہ سلسلہ پھیلتے پھیلتے ڈھیروں زائرین کی آمد اور پھر عرس منانے تک چلا جاتا ہے۔

عبدل نے کوہ ناڈہ کھنڈر حویلی کے متعلق ایک جھوٹ گڑھا تھا کہ سید محمد خان نے یہاں چلہ کشی کی تھی جسے سچ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ کئی جھوٹی عبارتیں مزار پر کندہ ہوتی ہیں۔ ناول کے اس اقتباس میں واضح ہے:

"یہاں حضرت سید محمد خانؒ نے جنگ بالا کوٹ میں حصہ لینے سے پہلے برسوں چلہ کشی کی اور دیواروں پر بنے یہ مقدس نقش انہوں نے اسی تلوار سے بنائے تھے، جس سے بعد ازاں انہوں نے درجنوں سکھوں کو موت کے گھاٹ اتارا"(7)

حالاں کہ اس جگہ کے متعلق بذات خود سید محمد خان کے کوئی اچھے خیالات نہ تھے لیکن اس کی موت کے بعد لوگوں نے یہ باتیں ان سے منسوب کر دیں۔ مصنف سماج کے باشعور طبقے کو بتانا چاہ رہا ہے کہ "خانقاہی نظام" اس خطے میں کئی صدیوں سے چلا آ رہا ہے لیکن اکیسویں صدی کے جدید سائنسی ترقی کے دور میں ہمارا یہ المیہ ہے کہ لوگ باشعور ہونے کے

باوجود "خانقاہی نظام" پر اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ جہالت کا یہ عالم ہے کہ لوگ نرینہ اولاد کے لیے بھی ان پیروں فقیروں کے پاس جاتے ہیں۔

ناول کی کہانی کا بڑا حصہ جنگ اور لڑائیوں کے حالات و واقعات پر ہی مبنی ہے لیکن انہی جنگی حکمت عملیوں کے ساتھ ساتھ قاری کو دیگر موضوعات مثلاً تاریخی معاشرت کی عکاسی، ماضی کی ستائش، طبقاتی تقسیم، اپنوں کی غداری، محبت، ہجر، تنہائی اور عورتوں کے فطری کردار کے متعلق پڑھنے کو ملتے ہیں ناول کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس میں ایک موضوع کو بنیاد بنا کر کئی ثانوی موضوعات پر بات کی گئی ہے اور اس کے لیے جامع اور مدلل انداز اپنایا ہے۔ کسی بھی موضوع پر بات کرنے سے قبل غیر ضروری تمہید نہیں باندھی گئی ہے۔

فنی اعتبار سے پلاٹ ناول کا اہم ترین جزو ہے، جس کے ذریعے ناول نگار واقعات کو مربوط کرتا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور اس کے لیے پلاٹ کی الگ الگ سطحیں تشکیل دیتا ہے، جس سے کہیں تو پلاٹ سیدھا سپاٹ اور کہیں پیچیدہ اور گنجلک ہو جاتا ہے لیکن کہانی کی ترتیب ایسی ہونی چاہے کہ متین میں سے ایک واقعہ بھی حذف کریں تو وحدت تاثر متاثر ہو جائے۔ پلاٹ کے متعلق ارسطو کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

"پلاٹ کو ایک مکمل وحدت کا مظہر ہونا چاہیے۔ اس کے مختلف واقعات کی ترتیب ایسی ہونی چاہیے اگر ان میں سے کسی ایک کو ذرا ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے یا خارج کر دیا جائے تو وحدت کا اثر بُری طرح خراب ہو جائے"(8)

سلیمی نے پلاٹ کے ذریعے کہانی کو زمانی اور مکانی تناظر میں آگے بڑھایا ہے۔ ناول کا پلاٹ مربوط اور گٹھا ہوا ہے۔ ناول کے تمام واقعات میں ہی ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ تمام واقعات ہی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر اس میں سے ایک بھی واقعہ نکال دیا جائے تو یقیناً کہانی سمجھ میں نہیں آسکے گی لیکن پلاٹ میں کہیں کہیں پیچیدگی بھی پائی جاتی ہے یعنی کہ کہانی سیدھے سادھے انداز میں بیان کرنے کی بجائے گھومتی دکھائی دیتی ہے جسے کہانی میں دلچسپی اختتام تک موجود رہتی ہے۔ اس کے پلاٹ میں ضمنی قصے بھی کسی حد تک موجود ہیں۔ ناول نگار کسی کردار کو کہانی میں شامل کرتے ہیں تو اس کی پہلے ایک مختصر مگر جامع کہانی بتاتے ہیں۔ جس سے کردار کے متعلق مزید جاننے کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔

کسی بھی ناول کو جاندار اس کے مضبوط کردار بناتے ہیں، جن کے گرد ناول کی کہانی گھومتی ہے "لواخ" میں بھی کہانی چند کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ ان میں "سکندر" مرکزی کردار ہے، جو کہ فعال اور دائروی کردار ہے۔ یہی سکندر ایک بہادر جنگجو قبیلے کا چشم و چراغ ہوتا ہے، جس کے باپ دادا نے کئی معرکوں میں دشمنوں کو دھول چٹائی ہوتی ہے۔ سکندر کو اس کا باپ خانی زمان خان مری کے معرکہ میں جانے سے پہلے بستی کا اگلا سردار منتخب کرتا ہے اور اسے ایک تلوار، پگڑی اور نوشتہ دے کر جاتا ہے۔ تلوار وہ ہوتی ہے جسے اس نے امر سنگھ مجھیٹھیہ (سکھ سورما) کا قتل کیا تھا اور قتل کرتے وقت وہ پگڑی بھی اس نے لی ہوتی ہے۔ نوشتہ میں خانی زمان خان نے حسن علی خان کے کہنے پر اپنے بزرگوں کے شاندار ماضی اور فتوحات کی داستان لکھی ہوتی ہے تاکہ وہ آئندہ نسلوں تک مستند انداز میں پہنچ سکے چونکہ انگریز حکام تاریخی واقعات میں

ردوبدل کروارہے تھے۔باپ بیٹے کو کہتا ہے کہ مری کی فتح کی نوید پر وہ لواخ روشن کرے گا اور اجداد کی تاریخ وہ آئندہ نسلوں تک پہنچائے گا۔لیکن بد قسمتی سے بستی والے یہ معرکہ ہار جاتے ہیں، جس پر انگریز حکام انھیں قتل کر دیتے ہیں اور بستی کو بھی جلا دیتے ہیں۔اس کا سکندر گہرا صدمہ لیتا ہے۔سکندر اپنے باپ کی مخبری کرنے والے شخص ناظم خان کو تو قتل کر دیتا ہے لیکن پھر ساری زندگی چھپتا چھپاتا رہتا ہے اور تینتیس سال بعد نوشتے اور تلوار کو جلتے لواخ کی نذر کر دیتا ہے۔جبکہ باپ کی پگڑی کو کاسۂ گدائی کے طور پر استعمال کرتا ہے۔سکندر اپنے قبیلے کی تاریخ کو امر کرنے والا آخری شخص تھا لیکن اپنی جان بچانے کی خاطر وہ تمام تر نشانیاں جلا دیتا ہے اور اپنے دادا کے مزار پر فقیر کی طرح بقیہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتا ہے۔اگر دیکھا جائے تو وہ اپنے ماں باپ، حسن علی خان اور بستی والوں کی کسی بھی امید پر پورا نہیں اترتا۔

راقم کے نزدیک سکندر کے کردار کے دو رخ ہیں۔مصنف نے سکندر کے کردار کو نہایت خوبصورتی سے تراشا ہے۔کہیں وہ معصوم بچہ نظر آتا ہے جسے کھیلنے کا شغف ہوتا ہے تو کہیں ایک بے بس نوجوان جس کے باپ، چچا، خاندان اور بستی کے کئی دیگر لوگوں کو جنگ میں مار دیا جاتا ہے اور وہ دکھ میں سب سے چھپ کے روتا ہے اور کسی مقام پر اسے فقیر کے روپ میں لاچار بوڑھا دکھایا جاتا ہے جو لنگر سے کھانے کے حصول کے لیے قطاروں میں کھڑا رہتا ہے۔وہ ماضی کو بھلانے کی جستجو میں ہندو آنہ اور مومنانہ دونوں طریقے آزماتا ہے۔وہ کبھی پرکاش یوگی کا بتایا نسخہ "سانس پر دھیان دو" اور کبھی صوفی بزرگ کا بتایا طریقہ "مراقبہ" بھی کرتا ہے۔آخر کار سکون اسے لواخ جلا کر تلوار اور نوشتہ اس میں پھینکنے کے بعد ہی آتا ہے۔

دوسرا اہم کردار "خانی زمان خان" کا ہے۔یہ سکندر کا باپ اور بستی کا سردار ہوتا ہے۔اس نے کئی جنگوں اور معرکوں میں دشمن کو زیر کیا ہوتا ہے۔اس نے ہی حسن علی خان کے کہنے پر اجداد کی تاریخ کو نوشتے میں قلم بند کیا ہوتا ہے۔خانی زمان خان کو کہانی میں بہادر، دلیر، معاملہ فہم اور جانباز دکھایا گیا ہے۔اس کی بہادری کا اندازہ ناظم خان کی اس بات سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ جب انہیں معرکہ مری میں شکست ہونے کے بعد توپ کے آگے باندھ کر آخری خواہش پوچھی گئی تو:

"اس نے کہا تھا کہ مجھے کھولیں اور دوبارہ توپ کے دہانے کے آگے اس طرح باندھیں کہ میرا منہ توپ کی طرف ہو، میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سامنا کرنا چاہتا ہوں"(9)

ناول میں "حسن علی خاں کا کردار بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔وہ خانی زمان خان کے دور کے رشتے دار تھے لیکن انھیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔اس کے علاوہ حسن علی خان قبیلے کے سردار بھی تھے۔بہادری، جرات مندی، ذہانت، قوتِ فیصلہ، معاملہ فہمی اور تدبر ان کے کردار کی نمایاں خصوصیات ہیں۔حسن علی خان کی حکمت عملیوں کی بدولت ہی چھوٹے سے قبیلے کو سکھ افواج فتح نہیں کر سکی تھی۔

"عبدل" کا کردار بھی ناول کے آغاز میں تخلیق کیا ہے، جو سکندر کا ہم راز ہوتا ہے۔سکندر کی عبدل سے ملاقات اس کے دادا کے مزار پر ہوتی ہے۔عبدل سکندر کو پہچان جاتا ہے وہ نہ صرف سکندر کی مدد کرتا ہے بلکہ اس کو ہر حوالے سے مفید مشورے بھی دیتا ہے، اس کے علاوہ عبدل کو سمجھدار اور باتونی بھی دکھایا گیا ہے۔عبدل وہی شخص ہے جو

سکندر کے دادا یعنی "سید محمد خان" کے مزار کی بنیاد ڈالتا ہے یعنی یہ وہ کردار ہے، جس کے ذریعے ناول نگار نے بتایا کہ کوئی ایک شخص پہلے مزار کی بنیاد رکھتا ہے بعد ازاں لوگ جوک در جوک حاضری کے لیے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

ناول کے ضمنی کرداروں میں ناظم خان، سید محمد خان (سکندر کے دادا)، محمد خان ترین، غلام خان ترین، مولوی عنایت اللہ، سید احمد بریلوی، ہری سنگھ نارہ، باز خان، فقیر خان، آزاد خان، شیر بہادر خان اور مہتاب سنگھ وغیرہ کے نام شامل ہیں جو تھوڑے وقت کے لیے آتے ہیں لیکن کہانی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ہر ناول نگار خاص طریقہ کار کے تحت ناول تحریر کرتا ہے، جس کو تکنیک کہتے ہیں "تکنیک وہ طریقہ کار ہے، جس کے ذریعے مصنف اپنے تجربات و مشاہدات کا اظہار مختلف اسالیب بیان میں کرتا ہے"(10) اختر رضا سلیمی نے کہانی کو بیان کرنے کے لیے "بیانیہ" تکنیک کا استعمال زیادہ کیا ہے اور اس کا راوی "سکندر" ہے۔ اسے "واحد حاضر متکلم" بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ خود کہانی کا ایک کردار بھی اور راوی بھی ہے۔ کہانی کی شروعات میں سکندر واحد حاضر متکلم راوی کے طور پر اپنی روداد بیان کرتا ہے۔ لیکن بعد میں عبدل کے آجانے سے دو متکلم راوی کہانی میں دکھائی دیتے ہیں۔

ناول میں سکندر جب نوشتے پر لکھی کہانی پڑھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی کہانی یعنی آپ بیتی (Autobiogarapgy) بیان کرتا ہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ وہ اپنے باپ یعنی خانی زمانی خان اور حسن علی خان کے علاہ کئی لوگوں کی مختصر سوانح بھی بیان کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کہانی میں "فلیش بیک اور خود کلامی اور آزاد تلازمہ خیال کی تکنیکوں کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار "سکندر" کبھی حال سے ماضی کی جانب چلا جاتا ہے اور کبھی حال سے مستقبل کی جانب چلا جاتا ہے۔ خود کلامی تکنیک کا استعمال فلیش بیک تکنیک کی نسبت کم کیا گیا ہے۔

ناول کے ترکیبی عناصر اسلوب بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اسلوب کے ذریعے ہی مصنف کے خیالات، زبان و بیان اور ذخیرہ الفاظ کا اندازہ ہوتا ہے اور کسی بھی فن پارے کو دلکش اور ریڈ ایبل بنانے کے قابل اسلوب ہی بناتا ہے دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ اسلوب مصنف کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے تو غلط نہیں ہو گا۔ طارق سعید اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں:

"کسی ادبی تخلیق کی وہ خصوصیات جن کا تعلق خیال یا موضوع کی مناسب صورت یا اظہار ہی سے ہوتا ہے اسلوب کہلاتا ہے"(11)

اگر "لواخ" کے اسلوب کی بات کی جائے تو ناول نگار نے علامتی و استعاراتی یا تجریدی اسلوب کے بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم اسلوب کے ذریعے بیانیہ تشکیل دیا ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ناول میں اٹھارویں صدی کی جنگیں، واقعات رسم و رواج کا بیان ہے اگر ثقیل یا شاعرانہ اسلوب میں بیان کی جاتی تو ناول عام قاری کی توجہ کا مرکز نہ بنتا۔ ناول میں کئی مقامات پر تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے لیکن وہ اتنی مشکل یا پیچیدہ نہیں کہ عام قاری سمجھ نہ سکے مثلا اس کے علاوہ بے جا لفاظی نہیں کی گئی کہ قاری ناول کو پڑھتے وقت الجھن، بیزاری یا کسی قسم کی دقت محسوس نہیں کرتا البتہ کہیں کہیں اُردو محاورات اور روزمرہ کا استعمال کر کے بیانیے کو دلکش بنایا گیا چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

"دونوں مرتبہ تھانے دار نے مجھے دیکھتے ہی ایک فقرہ اچھالا تھا۔"یہ پاگل کہاں سے اٹھا لائے ہو، میں نے اس کا اچار ڈالنا ہے"۔(12)

"حسن علی خان کا نام دیکھتے ہی تھانے دار کو اپنے کاندھے پر ایک اور پھول سجتا نظر آئے گا اور اس کا دل خوشی سے باغ باغ ہو جائے گا"۔(13)

اختر رضا سلیمی کے فکشن کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ جو فن پارہ بھی تخلیق کرتے ہیں ۔اس کا لوکیل پہاڑی علاقوں کے مختلف مقامات، تاریخ، تہذیب اور ثقافت ہوتی ہے۔وہ اپنے ناولوں کے ذریعے جدید دور کے قاری کو کبھی تو جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی کسک سنواتے ہیں تو کبھی دور دیہات میں جندر کے ذریعے مٹتی تہذیب سے آشنا کراتے ہیں اور کبھی جنگجو قبیلوں کی سکھوں کے ساتھ معرکے اور فرنگیوں کے سامنے دلیر اور بہادری کی مثال قائم کرنے والے کرداروں کا تعارف کراتے ہیں۔

مجموعی طور پر "لوخ کے مطالعے سے ادب کے قاری کو اس بات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے، جو تاریخ کی کتب میں لکھی مسخ تاریخ کو پڑھ کر صرف دہلی اور گرد و نواح کے علاقوں میں مسلمانوں کی فتوحات کے متعلق جانتے تھے لیکن جنگِ آزادی سے قبل پہاڑی علاقوں میں مختلف قبیلوں کی سکھوں اور انگریزوں کے خلاف مزاحمت سے نابلد تھے۔اس کے علاوہ مختصر سے ناول کے ذریعے سیاہ طاقوں میں پڑی تاریخ کو الاؤ جلا کر روشن کر دیا اور یہی اس ناول کی خوب صورتی ہے۔

حوالہ جات

1۔ نثار ترابی ،" جاگے ہیں خواب میں : ایک مختصر تاثر"، مشمولہ : ششماہی امتزاج، کراچی: شمارہ 04، جولائی تا دسمبر 2015ء، ص:152

2۔ اختر رضا سلیمی، "لواخ"، راولپنڈی: رمیل پبلی کیشنز، 2023ء، ص:184

3۔ ایضاً، ص:95

4۔ ایضاً، ص:113

5۔ ایضاً، ص:08

6۔ ایضاً، ص:11

7۔ ایضاً، ص:167

8۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، "ارسطو سے ایلیٹ تک"، اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، 2012ء، ص:108

9۔ اختر رضا سلیمی، "لواخ"، ص:144

10۔ ڈاکٹر محمد یٰسین، "ناول کا فن اور نظریہ"، لاہور: دارالنوادر، 2013ء، ص:21

11۔ طارق سعید، "اسلوبیات"، لاہور: نگارشات، 1998ء، ص:21

12۔ اختر رضا سلیمی، "لواخ"، ص:12

13۔ ایضاً، ص:18